کلاسیکی اردو غزل کے نمائندہ شعرا اور اقبال کی غزل گوئی

ڈاکٹر فرزانہ ریاض
وزٹنگ فیکلٹی، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

IQBAL'S GHAZAL AND REPRESENTATIVES OF CLASSIC URDU GHAZAL

Farzana Riaz, PhD
Visiting Faculty Urdu
GC University, Lahore

Abstract

Allama Iqbal is a versatile, visionary and world - recognized poet, but many aspects of the exotic splendour of his art and thought have yet to be studied. One such aspect is impact of renowned classical poets like Ghalib and Daagh on his poetry. Iqbal accepted the impact of these classical poets in his ghazals with the true touch of genius, and took it one stage forward.

Keywords:
کلاسیکی، اردو، جرمنی، غزل، ادبی، غالب، اقبال، سلیم اختر، کلیات اقبال، لاہور

بطور ادبی اصطلاح کلاسیکی کا اطلاق ماضی کے اس تخلیقی فنکار اور صاحبِ اسلوب قلم کار پر کیا جاتا ہے جو بلحاظ تخلیق آپ اپنی مثال ہو اور جس کے فکر وفن کی ندرت اور اسلوب کی انفرادیت کو آنے والی نسلوں نے خراجِ تحسین پیش کیا ہو۔

فکری اصطلاح کے طور پر کلاسیکی رویّہ سے مراد وہ تخلیقی سوچ ہے جس میں نظم وترتیب، عقلیت اور میانہ روی پر زور دیا جاتا ہے۔ کلاسیکیت میں جذباتیت، تخیل، تصور پرستی، حزن وملال اور المیہ کی گنجائش نہیں۔

J.K. THOMSON کے خیال میں:

''کلاسیکی ادب وہ ہے جس میں دلیل اور تعقل کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔''(۱)

صدیوں تک لاطینی، جرمنی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کے تخلیق کار کلاسیکیت کے زیرِ اثر رہے لیکن بالآخر بطور رہنما تخلیقی اصول اس کا اختتام ۱۸۱۷ء قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کولرج کی "Biographia Literaria" کا سالِ اشاعت بھی ہے۔

کلاسیک غیر شخصی ہوتا ہے اور اس میں صدیوں پرانی روایات اور نسلوں کا دل بھی دھڑک رہا ہوتا ہے اور یہ مستقبل کے قاری کو بھی یکساں جمالیاتی تسکین عطا کرتا ہے۔ کلاسیک میں پُرعظمت خیال، پُرشکوہ تصور اور ایسی فکر جو حیاتِ دوام حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو ہمیشہ اہم ترین عناصر شمار ہوتے ہیں۔ کلاسیک ذاتی کی بجائے غیر ذاتی، زمانی لحاظ سے دوامی اور غیر دوامی موضوعی کی بجائے غیر معروضی، خواب گوں کے بجائے حقیقی، مابعد الطبیعیاتی کی بجائے عملی ہوتا ہے۔ کلاسیکیت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر زمانہ بآسانی اپنا عکس دیکھ سکتا ہے۔'' کلاسیک اپنے دور کا ترجمان ہوتا ہے۔''(۲)

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''کلاسیکیت تاریخی اور جغرافیائی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے اور اس پر وقت اور ماحول کی قید نہیں لگائی جاسکتی۔''(۳)

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کے خیال میں:

''اردو کلاسیکیت کی اصطلاح، انگریزی کی اصطلاح Classicism کے ترجمے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ Classicism کا لفظ Classic سے بنا ہے جس کے معنی لغت میں قدیم، اعلیٰ درجے کا، مستند اور علم الثبوت بیان کیے جاتے ہیں۔ اس لفظ کا پس منظر یہ ہے کہ یونان میں فوج کے اعلیٰ ترین یعنی شہسواروں کو کلاسیک کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ ادب میں قدیم راسخ طریقوں اور فنی اصولوں پر عمل پیرا ہونے والے مصنفوں اور ان کی تصانیف،

دونوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔یونانی اور رُومی تصانیف اس سلسلے میں مثالی اور قابلِ تقلید ٹھہریں اور انھیں کلاسیک Classic کا نام دیا گیا یورپی ادبیات میں ادبی رہنمائی کے لیے یونانی اور رومی مصنفین کی کلاسیک تحریروں سے رجوع کرنا کلاسیکیت کہلایا۔یوں کلاسیکیت کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ موضوع،طرزِ بیان،تشبیہ،استعارہ اور زبان کے سلسلے میں یونانی اور رومی نمونوں کی تقلید کی جائے۔"(۴)

کلاسیکیت کے لیے قدامت کی شرط اس لیے ہے کہ اس کی خصوصیات کے تعین اور اس کی روایت بننے میں وقت لگتا ہے۔محض ایک دو افراد یا گروہ یا مختصر مدت کے رجحان کو کلاسیکیت نہیں کہا جا سکتا۔یہ معاشرے اور تہذیب کا فطری عمل ہے۔کلاسیکی اقدار کو بار بار آزمایا جاتا ہے اور وقت کی کسوٹی پر کس کر معاشرہ اسے مانتا اور قبول کرتا ہے۔کلاسیکیت ہی کی روشنی میں کسی معاشرہ کی بنیادی اور ادبی اقدار متعین ہوتی ہیں۔ کلاسیکیت کی ایک اور خصوصیت نبوغت ہے یعنی جو ادب کلاسیکی ہے وہ یقیناً اعلیٰ درجہ کا بھی ہوتا ہے۔اس تفصیل کی روشنی میں کلاسیکی ادب کی تعریف یہ کر سکتے ہیں:

"وہ ادب جو قدیم ہو،اعلیٰ درجہ کا ہو اور جو آزمودہ اور تسلیم شدہ ہو ساتھ ہی جس کی ایک مستحکم روایت موجود ہو،کلاسیکی ادب کہلاتا ہے۔"(۵)

ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں:

"کلاسیک ان دائمی عناصر کو سامنے لاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ افراد کو جمالیاتی تسکین بہم پہنچانے کی سکت رکھتے ہیں۔"(۶)

ڈاکٹر سلیم اختر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"کلاسیکی ذہن تخلیقی عمل میں بے حدود ہونے کے مقابلہ میں حدود کا لحاظ رکھتا ہے اسی لیے اساسی طور پر محدود ہوتا ہے۔چنانچہ کلاسیکی ادیب بنیادی طور پر ہیئت پرست،قواعد پرست، ضوابط پرست اور اصول پرست ہوتا ہے۔"(۷)

یہ سب تعریفات کلاسیک کو ایک وسیع تناظر عطا کرتی ہیں اور اس کی حدودِ تخلیق کو زمان و مکان سے بھی ماورا کر دیتی ہیں۔

موضوع،اسلوب اور ادیب کی شخصیت، کلاسیکیت کی بنیادی خصوصیات ہیں۔کلاسیکیت کی دیگر بہت سی خصوصیات انھی تین بنیادی خصوصیات میں سے ہی اخذ کی گئیں ہیں۔کلاسیکی تخلیق ان تین بنیادی خصوصیات سے مل کر ایک ایسا ادب تخلیق کرتی ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ منزل بن جاتا ہے۔

شیکسپیئر، دانتے، جان ملٹن، فردوسی، حافظ، رومی، ولی، غالب، اقبال کا اپنے عہد کی عظیم شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جو کلاسیکی ادب تخلیق کیا وہ ایک ایسی داخلی عظمت سے مملو تھا کہ ہر عہد کا انسان بے اختیار اسی کی طرف کھینچا چلا گیا۔

علامہ اقبال اپنے عہد کے نابغۂ فکر و فن تھے۔ ان کی شخصیت کی تکمیل میں ان کے خاندانی ورثے اور ملکی ماحول نے یکساں کردار سرانجام دیا تھا۔ بقول پروفیسر ایم ایم اشرف:

> ''اقبال اپنے زمانے کی پیداوار تھے اور ان کی شمع خیال متقدمین کے چراغِ فکر کی مرہونِ منت بھی تھی۔''(۸)

علامہ اقبال ایک ایسے شاعر تھے جن کے فکر کی جولان گاہ اگر مستقبل تھا تو انھوں نے ماضی کو بھی فراموش نہیں کیا۔ انھوں نے ماضی کے متوازن، معیاری اور مثالی اقدار سے جوہر کشید کیا اور پورے اعتماد سے اسے مستقبل کی افزائش میں استعمال کرنے کی سعی کی۔ علامہ اقبال کی زندگی پر جس شخص نے اپنے کردار و عمل کا اوّلین نقش مرتّب کیا وہ ان کے والد شیخ نور محمد تھے۔ علامہ اقبال نے انھیں اپنا مُرشد تسلیم کیا۔

پدر و مُرشدِ اقبال ازیں عالم رفت
ما ہمہ راہرواں منزلِ ما ملکِ ابد(۹)

علامہ اقبال نے اپنے والد سے اخلاقیات، تہذیب اور مذہبیات کا جو تاثر قبول کیا اس کے نقوش گہرے اور انمٹ تھے اور یہ شیخ نور محمد کے فیضانِ تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ علامہ اقبال کو مولانا سیّد میر حسن جیسا کلاسیکی فطرت کا استاد ملا۔ ان کی تعلیم کا خاصہ یہ تھا کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھتا اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے سیّد میر حسن سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ان زبانوں کے کلاسیکی اسلوب کو قبول کیا اور کھوئے ہوئے دوستوں، بچھڑی ہوئی منزلوں، گزرے ہوئے کاروانوں، دور افتادہ محبوباؤں اور مسافتوں کے گم شدہ نشانوں کو اپنے داخل میں سمو لیا۔ پروفیسر مرزا محمد منور لکھتے ہیں:

> ''علامہ اقبال نے فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اردو زبان کی تحصیل بھی مکمل کی۔ مگر حق یہ ہے کہ عربیت ان کی رُوح میں سرایت کر گئی تھی۔''(۱۰)

اس لسانی پس منظر نے ان کی عقیدت و ارادت کو مضبوط تر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سیّد میر حسن کا ایک اور فیضان یہ ہے کہ انھوں نے علّامہ اقبال کے دل میں طلبِ علم اور تلاشِ حق کا جذبہ پیدا کیا۔ سیّد میر حسن بڑے بزرگ عالم اور شعر فہم تھے۔ اقبال نے انھی سے اکتسابِ فیض کیا۔ اقبال ابھی سکول میں ہی پڑھتے

تھے کہ کلامِ موزوں زبان سے نکلنے لگا۔پنجاب میں اردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں زبان دانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا۔سیالکوٹ میں بھی اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔اس کے لیے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔شعرائے اردو میں ان دنوں نواب مرزا داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا اور نظام دکن کے استاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔لوگ جوان کے پاس جا نہیں سکتے تھے خط کتابت کے ذریعے دور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کر لیتے تھے۔ غزلیں ڈاک میں ان کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس کر دیتے تھے۔علامہ اقبال نے بھی انھیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔اس طرح اقبال کو اردو دانی کے لیے بھی ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فنِ غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔اقبال کے مزاج میں کلاسیکیت کے نقوش پیدا کرنے میں جو فریضہ سیّد میر حسن نے ادا کیا تھا انھیں پختہ تر کرنے میں ایک اہم کردار نواب مرزا داغ دہلوی کے تلمذ نے بھی ادا کیا۔اس ضمن میں انور سدید رقمطراز ہیں:

> ''جس زمانے میں اقبال کی شاعری کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں مرزا داغ کی زبان غزل کی مثالی زبان شمار ہوتی تھی اور ان کا تغزل عشق و محبت کی لذیذ لطافتوں کا نکتہ سرا تھا۔داغ اس مٹتی ہوئی تہذیب کا آخری سخن ور تھا جس کا نوحہ مرزا غالب نے لکھا۔چنانچہ اقبال نے داغ کی شاگردی اختیار کی تو زبان و بیان کی وہ تمام تہذیبی دلالتیں اور فکر و فن کی وہ تمام مثالی روایتیں جو مرزا غالب کی بدولت اردو غزل میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی تھیں، اقبال کی شاعری میں بھی رُونما ہوئیں اور عشق مجازی کی چاشنی اور تصوف کی روایتی لذت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔''(۱۱)

اقبال نے سیّد میر حسن سے جو تربیت عربی اور فارسی کے گہوارے میں حاصل کی تھی اس کی تکمیل داغ نے اردو کے گہوارے میں کی۔تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربی و فارسی نے ان کی اردو کی صلاحیت پہلے ہی پختہ کر دی تھی۔چنانچہ چند ہی غزلوں کی اصلاح کے بعد داغ نے انھیں غائبانہ مشورۂ سخن سے آزاد کر دیا۔ ہر چند اقبال کی زبان کا انفرادی رنگ ان کی شاعری کے اوّلین دور سے ہی نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا، تاہم یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے صحتِ زبان کے مروّجہ ضوابط کو قبول کیا اور داغ کے اسلوب میں زبان کا کلاسیکی پیکر استعمال کرنے کی سعی کی۔سیّد عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> ''داغ کی غزل میں اردو شعری روایت کے تمام علائم و رموز موجود تھے۔اقبال نے ان کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر اپنے سیاسی، ملی اور فلسفیانہ افکار کے ابلاغ کے لیے انھی علائم و رموز کو نئی معنویت دی۔''(۱۲)

ڈاکٹرفرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''علامہ نے شعروسخن کے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جس میں ان کے ذوقِ شعری کی تربیت ہوئی اس میں حالی، داغ اور میر کا بہت چرچا تھا۔لیکن داغ کے یہاں ہلکے پھلکے عشقیہ جذبات کے ساتھ زبان و بیان کا ایسا چٹخارہ تھا کہ زیادہ تر لوگ انھی کی طرف متوجہ تھے۔ چنانچہ اقبال بھی اسی طرف لپکے اور داغ کی پیروی کو مستحسن خیال کیا یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ان کے گردوپیش اور ان کے آغازِ شباب کی امنگوں کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ مشقِ سخن کی ابتدا غزل سے کرتے اور اسی رنگ کو اپناتے جس پر چھوٹے بڑے سبھی جان چھڑک رہے تھے۔''(۱۳)

علامہ اقبال نے بھی یہی کیا۔داغ کی شاگردی قبول کر کے انھی کے رنگ میں غزلیں کہنے لگے۔ چنانچہ بانگ درا میں ان کی ابتدائی کئی غزلیں داغ کے رنگ میں نظر آتی ہیں،دیکھیے:

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ ، مرا انتظار دیکھ(اقبال)(۱۴)

کیا ذوق ہے کیا شوق ہے سو مرتبہ دیکھوں
پھر بھی یہ کہوں جلوۂ جاناں نہیں دیکھا(داغ)(۱۵)

نہ آتے ، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی(اقبال)(۱۶)

انکار سے امید ہے اقرار سے ہے یاس
جب وعدہ کیا پھر وہ مکرر نہیں ملتا(داغ)(۱۷)

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیوں کر ہوا(اقبال)(۱۸)

غضب ہے انتظارِ وعدۂ حشر
یہیں کہہ کر مکر جائے تو اچھا (داغ)(۱۹)

تو نے یہ کیا غضب کیا ، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں(اقبال)(۲۰)

فلک پردہ بنا اہلِ زمیں کی پردہ پوشی کو
مگر اس دشمنِ جاں نے کسی کا عیب کیا ڈھانکا(داغ)(۲۱)

اُڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی (اقبال)(۲۲)

نہ جلتا طور کیونکر ، کس طرح موسیٰ نہ غش کھاتے
کہاں یہ تاب و طاقت جلوہ دیکھیے مرد یک تیرا (داغ)(۲۳)

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے(اقبال)(۲۴)

ڈرتا ہوں دیکھ کر دل بے آرزو کو میں
سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو مہمان تو گیا(داغ)(۲۵)

داغ کی وفات پر اس کے بہت سے شاگردوں نے مرثیے لکھے جن کا اب کہیں نام ونشان نہیں۔ لیکن اقبال نے جو مرثیہ لکھا وہ داغ کے کمالات کی صحیح تصویر ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال، داغ کے کلام سے کس قدر متاثر تھے۔اس مرثیہ میں داغ کی زبان کو بھی اہمیت دی اور اسے ''کاشانۂ اُردو کا گل رنگین'' قرار دیا۔مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار کا حوالہ بے محل نہ ہوگا:

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیِ معنی وہاں بے پردہ ، یاں محمل میں ہے

وہ گُلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بُو ہُوا
آہ! خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہُوا

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اُٹھ گیا ناوک فگن ، مارے گا دل پر تیر کون؟(۲۶)

داغ دہلوی کے زیرِ اثر ان کی غزل روایتی موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔ان غزلوں کا تکنیکی رنگ وآہنگ بھی داغ سے مستعار ہے۔اس ابتدائی زمانے کی یادگار غزلیں بانگِ درا میں موجود ہیں۔سب سے پہلے مشاعرے ہی میں اقبال نے جو غزل پڑھی اس کا مقطع یہ تھا:

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلف کمال کے(اقبال)(۲۷)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اقبال عشقِ مجازی کا شاعر نہ تھا لیکن محض مشقِ سخن کے طور پر مصنوعی عاشقی کی کچھ غزلیں اقبال نے کہیں .....ان غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جا بجا داغ کی زبان کی مشق کر رہے ہیں ۔موضوع بھی وہی داغ والے ہیں۔کہیں کہیں داغ کے انداز کے شعر نکال لیتے ہیں۔''(۲۸)

ستم ہو کہ وہ وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں(اقبال)(۲۹)

کیا ہے وعدۂ فردا کسی نے دیکھیے کیا ہو
یہاں صبر و تحمل آج ہی سے ہو نہیں سکتا(داغ)(۳۰)

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی(اقبال)(۳۱)

الٰہی دیکھیے کافر نگاہیں کیا دکھاتی ہیں
بڑا لپکا پڑا ہے اس کی آنکھوں کو اشارے کا(داغ)(۳۲)

اقبال نے داغ کے لب ولہجہ میں اپنا لب ولہجہ شامل کر کے غزل کو اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بتدریج ایک خاص کلاسیکی نکھار عطا کیا۔

اردو غزل میں اقبال کا ظہور ایک ایسے مقام پر ہوا جب سودا کی جامد لفاظی، غالب کی متحرک اور زندہ معنویت کے آگے دم توڑ چکی تھی اور الطاف حسین حالی اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ کر نئی غزل کا دستور العمل پیش کر چکے تھے۔اقبال کے کلام میں بہت سے مختلف شعرا کی خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔اس میں حالی و اکبر کا احیائے قوم ہے، شبلی کی محبت ملّت ہے، غالب کی خودداری اور مشکل پسندی ہے اور میر کا اثر ہے۔

بلند پروازی، نزاکت خیال، اندازِ بیان اور لطفِ ادا میں اقبال نے سب سے زیادہ غالب سے استفادہ کیا ہے۔اس بارے میں نقادانِ فن کی یہ رائے ہے کہ: ''اگر حالی کو اقبال میں سے تفریق کر دیا جائے تو حاصل تفریق غالب کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔''(۳۳)

ہندوستان کے تمام اساتذہ میں ایک خاص رنگ موجود تھا جو ان کے کلام کی خصوصیت رہا ہے۔اسی طرح اقبال کا رنگ غالب کے رنگ سے بھی ملتا ہے۔غالب کے بعد چشمِ ہندوستان اقبال کی وجہ سے پُرنور ہے۔شیخ عبدالقادر کا یہ خیال انتقادی حیثیت سے قابلِ قدر ہے:

''کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیاں پھر وجود میں آئیں گے۔۔۔ غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔''(۳۴)

کسی قدیم استاد نے اساتذہ کی جانشینی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کو اس طرح بیان کیا ہے:

''ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید
بہ جامی سخن را تمامی رسید

غالب نے اس پر اس شعر کا اضافہ کیا تھا:

ز جامی و عرفی و طالب رسید
ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

سیّد محمد علی نے اس پر ان دو شعروں کا اضافہ کیا:

چو غالب ز ہندوستاں رخت بست
بجائے وے اقبال دانا نشست
یقیں داں سخن دانِ باستاں
بماند بہ ہندوستاں جاوداں''(۳۵)

علامہ اقبال، مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت کے ہمیشہ قائل رہے ہیں۔ بانگِ درا کی ابتدائی نظموں میں ایک عنوان ''مرزا غالب'' ہے۔ اس میں اقبال نے اردو اور فارسی کے اس عظیم شاعر کے حسن تخیل اور لطف گویائی کو نا قابلِ تقلید قرار دیا ہے اور اس کا مقابلہ گوئٹے سے کیا ہے۔ بیاض میں غالب کو بے مثال خراجِ تحسین ادا کیا ہے:

''میری رائے میں مرزا غالب کا فارسی کلام شاید مسلمانانِ ہند کی جانب سے وہ واحد پیش کش ہے جس سے ملت کے عام ادبی سرمائے میں کوئی مستقل اضافہ ہوا ہے۔ غالب یقیناً ان شعرا میں سے ہیں جن کا ذہن اور تخیل انھیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے۔ غالب شناسی کا حق ادا ہونا ابھی باقی ہے۔''(۳۶)

بیاض ہی میں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں۔''(۳۷)

بانگِ درا میں غالب کی عظمت کو یوں تسلیم کیا:

لطف گویائی میں تیری ہم سَری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں(۳۸)

غالب اور اقبال میں بعض اقدار و حقائق مشترک ہیں۔ دونوں نے اردو اور فارسی میں سخن سرائی کی اور ان زبانوں کے شعری ادب میں ہمیشہ کے لیے اپنی عظمت کا نقش چھوڑ گئے۔

اقبال نے میر و غالب کی زبان سے نطشے، برگساں، رومی، مارکس، گوئٹے اور ملٹن کے خیالات کی ترجمانی کی۔

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں(اقبال)(۳۹)

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں(غالب)(۴۰)

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی(اقبال)(۴۱)

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں(غالب)(۴۲)

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستیِ ناپائیدار دیکھ(اقبال)(۴۳)

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں(غالب)(۴۴)

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی(اقبال)(۴۵)

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں(غالب)(۴۶)

سوداگری نہیں ، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے(اقبال)(۴۷)

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو(غالب)(۴۸)

حسنِ کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیوں کر ہوا(اقبال)(۴۹)

ہے وہی بدمستی ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے(غالب)(۵۰)

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ(اقبال)(۵۱)

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے(غالب)(۵۲)

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا ، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے ، نگار خانہ ہے آرزو کا(اقبال)(۵۳)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان ، لیکن پھر بھی کم نکلے(غالب)(۵۴)

حامد حسن قادری میر، غالب اور اقبال کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کے فیضِ طبع نے اردو کو گنجِ زر دیا
اِک اثر میں بڑھ گیا اک رفعتِ تخئیل میں
تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری میں بس یہی دونوں کمال
تیسرے میں اس لیے دونوں کو یکجا کر دیا''(۵۵)

اقبال کلاسیکی روایت کی قدر قیمت کا گہرا عرفان رکھتے تھے۔اقبال نے روایتی الفاظ،استعارات اور علامات کو نئے معنوی آفاق سے روشناس کیا۔اس سے کلاسیکی غزل کا محدود جامد دائرہ لفظیات تحرک اور وسعت سے ہمکنار ہوا۔اقبال کی شاعری میں موضوع اور بحر کی ہم آہنگی،الفاظ و تراکیب،فقروں اور جملوں کی

تراش خراش، ردیف وقافیہ کے تال میل سے وہ ایک ایسے کلاسیکی آہنگ کی تشکیل کرتے ہیں جوانھیں خالقِ جمال بنادیتا ہے۔اقبال نے غزل کی قدیم صنف میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔اقبال نے کلاسیکی روایت سے استفادہ کرتے ہوئے غزل کواپنے مقصد کا آلہ بنایا۔جدّت طرازی،فن کارانہ صنعت گری، جذبہ وخیال کی پاکیزگی اور لہجے کی لطافت ومتانت،موضوعات کی رنگارنگی،میر کے اثرات کوظاہر کرتی ہے۔اسی طرح فارسی تراکیب اورتوانائی اضافت سے غالب کی یاد آتی ہے۔اقبال کلاسیکی روایت سے اپنے رشتے کوبکسرتوڑنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔اقبال نے اردوغزل میں حیرت انگیز مہارت دکھائی اوراساتذہ کے رنگ میں انتہائی فصاحت وبلاغت کے ساتھ،دقیق وعمیق فلسفیانہ،صوفیانہ،اخلاقی اورسائنسی مضامین بیان کیے ہیں۔

کلاسیک کااسلوب ایک طویل ادبی ریاضت کاثمر ہوتا ہے۔پرشکوہ زبان کلاسیک کی خوبی ہے۔ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ قواعد وضوابط کی پابندی کے باوجودانھوں نے زبان کے خارجی ڈھانچے کوشکستہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ان قواعد وضوابط کی پابندی کی جواردوشاعری میں مروّج تھیں۔اس ضمن میں اقبال کاخیال تھا:

"اگرہم نے پابندیِ عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کاقلعہ منہدم ہوجائے گا۔"(۵۶)

اقبال کا اسلوب شوکت وتحمل کے باوجودغنائیت اورنغمگی کی تاثیر سے محروم نہیں۔اقبال کے اسلوب کی تعمیر میں صرف فکر کی بلندی ہی اہم کرداراداانہیں کرتی بلکہ لفظیات کاشکوہ اوراوزان کی بلند آہنگی بھی شامل ہے۔یہ تمام عناصرآپس میں ایک لطیف رَبط رکھتے ہیں۔

اقبال نے زبان غزل کوبے انتہاوسعت دی۔غزلیات کامعتدبہ حصہ اساتذہ کے قالب ہائے شعر سے ہم آہنگ ہے۔ان کے تتبع میں غزل میں کلاسیکی آہنگ ومضامین سموناہنرمندی ہے۔ان کی غزلیں اس قابل ہیں کہ دوسرے شاعران کی تقلید کریں۔اقبال کا یہ بڑا کمال ہے کہ غزل میں کلاسیکیت کے رنگ بکھیر دیےمگرزبان کےلوچ میں فرق نہ آنے دیا۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) انورسدید۔اقبال کے کلاسیکی نقوش۔لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۸۸ء۔ص۱۱۸

(۲) یونس حسنی،ڈاکٹر۔ اختر شیرانی اور اس کی شاعری۔کراچی:انجمن ترقیِ اردوپاکستان، ۱۹۷۵ء۔ص۳۴

(۳) عبادت بریلوی،ڈاکٹر۔ تنقیدی زاویے۔لاہور:مکتبہ اردو،۱۹۵۱ء۔ص۱۷۷

(۴) فخرالحق نوری،ڈاکٹرمحمد۔منتخب ادبی اصطلاحیں۔لاہور:پولیمر پبلیکیشنز،۱۹۹۰ء۔ص۱۰۹

(۵) غلام آسی رشید۔اردو غزل کا تاریخی ارتقا۔نئی دہلی:موڈرن پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۶ء۔ص۳۳۵

(۶) وزیر آغا، ڈاکٹر۔تنقید اور مجلسی تنقید۔سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، ۱۹۶۷ء۔ص ۲۸۱
(۷) سلیم اختر، ڈاکٹر۔تنقیدی اصطلاحات۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔ص ۲۱۳
(۸) انور سدید۔اقبال کے کلاسیکی نقوش۔ص ۱۲۶
(۹) اقبال، ڈاکٹر، علامہ محمد۔کلیاتِ اقبال، فارسی۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء۔ص ۲۴
(۱۰) پروفیسر محمد معور۔میزانِ اقبال۔لاہور: یونیورسٹی بک ایجنسی، ۱۹۷۲ء۔ص ۲۵
(۱۱) انور سدید۔اقبال کے کلاسیکی نقوش۔ص ۱۲۹
(۱۲) عابد علی عابد، سیّد۔شعرِ اقبال۔لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۷۷ء۔ص ۴۷
(۱۳) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔غزل اردو کی شعری روایت۔ص ۱۵۲
(۱۴) اقبال، ڈاکٹر، علامہ محمد۔کلیاتِ اقبال۔کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۲۰۱۴ء۔ص ۱۵۷
(۱۵) داغ دہلوی۔دیوانِ داغ۔مرتب: یاور عظیم، راولپنڈی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء۔ص ۳۴
(۱۶) اقبال، ڈاکٹر، علامہ محمد۔کلیاتِ اقبال۔ص ۱۵۷
(۱۷) داغ دہلوی۔دیوانِ داغ۔ص ۵۲
(۱۸) اقبال، ڈاکٹر، علامہ محمد۔کلیاتِ اقبال۔ص ۱۶۰
(۱۹) داغ دہلوی۔دیوانِ داغ۔ص ۲۰
(۲۰) اقبال، ڈاکٹر، علامہ محمد۔کلیاتِ اقبال۔ص ۴۲۷
(۲۱) داغ دہلوی۔دیوانِ داغ۔ص ۲۳
(۲۲) اقبال، ڈاکٹر، علامہ محمد۔کلیاتِ اقبال۔ص ۱۶۳
(۲۳) داغ دہلوی۔دیوانِ داغ۔ص ۱۳
(۲۴) اقبال، ڈاکٹر، علامہ محمد۔کلیاتِ اقبال۔ص ۱۶۳
(۲۵) داغ دہلوی۔دیوانِ داغ۔ص ۶۶
(۲۶) اقبال، ڈاکٹر، علامہ محمد۔کلیاتِ اقبال۔ص ۱۴۶
(۲۷) خلیفہ عبدالحکیم۔فکرِ اقبال۔ص ۲۵
(۲۸) ایضاً۔ص ۲۶
(۲۹) خلیفہ عبدالحکیم۔کلیاتِ اقبال۔ص ۱۶۷
(۳۰) خلیفہ عبدالحکیم۔کلیاتِ داغ۔ص ۲۵
(۳۱) خلیفہ عبدالحکیم۔کلیاتِ اقبال۔ص ۴۲۷

(۳۲) خلیفہ عبدالحکیم ۔ کلیاتِ داغ ۔ص ۲۳

(۳۳) خلیفہ عبدالحکیم ۔ کلیاتِ اقبال ۔ص ۱۵۸

(۳۴) خلیفہ عبدالحکیم ۔ کلیاتِ داغ ۔ص ۳۷

(۳۵) نقوش ۔اقبال نمبر ۔لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۷۷ء ۔ص ۴۳۵

(۳۶) شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا ۔ کلیاتِ اقبال (دیباچہ) ۔ص ۲۶

(۳۷) نقوش ۔اقبال نمبر ۔ص ۴۰۲

(۳۸) شذراتِ فکرِ اقبال، مرتبہ: ۔ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال ۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۳ء ۔ص ۱۰۲

(۳۹) ایضاً ۔ص ۱۰۵

(۴۰) مرزا اسداللہ خان غالب ۔دیوانِ غالب ۔لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۱۴ء ۔ص ۶۰

(۴۱) اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد ۔ کلیاتِ اقبال ۔ص ۴۳۱

(۴۲) مرزا اسداللہ خان غالب ۔دیوانِ غالب ۔ص ۹۰

(۴۳) اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد ۔ کلیاتِ اقبال ۔ص ۴۳۳

(۴۴) مرزا اسداللہ خان غالب ۔دیوانِ غالب ۔ص ۱۱۰

(۴۵) اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد ۔ کلیاتِ اقبال ۔ص ۴۳۲

(۴۶) مرزا اسداللہ خان غالب ۔دیوانِ غالب ۔ص ۱۳۰

(۴۷) اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد ۔ کلیاتِ اقبال ۔ص ۴۲۷

(۴۸) مرزا اسداللہ خان غالب ۔دیوانِ غالب ۔ص ۱۴۲

(۴۹) اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد ۔ کلیاتِ اقبال ۔ص ۴۳۵

(۵۰) مرزا اسداللہ خان غالب ۔دیوانِ غالب ۔ص ۲۰۵

(۵۱) اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد ۔ کلیاتِ اقبال ۔ص ۴۴۰

(۵۲) مرزا اسداللہ خان غالب ۔دیوانِ غالب ۔ص ۲۰۷

(۵۳) اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد ۔ کلیاتِ اقبال ۔ص ۴۴۲

(۵۴) مرزا اسداللہ خان غالب ۔دیوانِ غالب ۔ص ۲۱۰

(۵۵) پروفیسر محمد منور ۔میزانِ اقبال ۔لاہور: یونیورسٹی بک ایجنسی، ۱۹۷۲ء ۔ص ۳۵

(۵۶) ایضاً ۔ص ۴۲